شیعہ: اثنا عشری

شیعہ (اثنا عشری) مسلمانوں کا دوسرا سب سے بڑا فرقہ ہے۔ شیعہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد دینی احکام اور روحانی اکتساب ان بارہ آئمہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی اولاد میں سے ہیں۔ اس لیے کہ شیعہ آئمہ اہلِ بیت ہی کو قرآن وسنتِ رسول ﷺ کا مستند شارح سمجھتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی ڈھانچے کی وحدت اور ملتِ اسلامیہ کی کلیت میں رہتے ہوئے ''شیعہ'' کی اصطلاح (جس کے لغوی معنی پارٹی یا متبعین کے ہیں) ان مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو اسلامی احکام میں صرف اہلِ بیت رسولؐ کا اتباع کرتے ہیں اور اس طرح لفظ ''شیعہ'' اصطلاحاً بارہ آئمہ کرام کے ماننے والوں کو کہا جاتا ہے اور یہ اضافت انہیں شیعیت کی بعض دوسری چھوٹی شاخوں مثلاً زیدیوں اور اسماعیلیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ زیدی اور اسماعیلی شیعوں کا موقف یہ ہے کہ مذہبی رہنمائی اگرچہ صرف اہلِ بیت رسولؐ ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن وہ آئمہ کی تعداد اور ان کے حقِ امامت کے بارے میں اثنا عشری شیعوں سے اختلاف کرتے ہیں۔

اثناءعشری درج ذیل بارہ آئمہ کو تسلیم کرتے ہیں:

۱۔	حضرت علی بن ابی طالبؑ	م (۴۰ھ/۶۶۱ء)
۲۔	حضرت حسن بن علیؑ	م (۴۹ھ/۶۶۹ء)
۳۔	حضرت حسین بن علیؑ	م (۶۱ھ/۶۸۰ء)
۴۔	حضرت علی بن حسین زین العابدینؑ	م (۹۵ھ/۷۱۴ء)
۵۔	حضرت محمد الباقرؑ	م (۱۱۵ھ/۷۳۳ء)
۶۔	حضرت جعفر الصادقؑ	م (۱۴۸ھ/۷۶۵ء)

۷۔	حضرت موسیٰ الکاظمؒ	م (۱۸۳ھ/۷۹۹ء)
۸۔	حضرت علی الرضاؒ	م (۲۰۳ھ/۸۱۸ء)
۹۔	حضرت محمد جواد التقیؒ	م (۲۲۰ھ/۸۳۵ء)
۱۰۔	حضرت علی النقیؒ	م (۲۵۴ھ/۸۶۸ء)
۱۱۔	حضرت الحسن العسکریؒ	م (۲۶۰ھ/۸۷۴ء)
۱۲۔	حضرت محمد المہدی القائم الحجہ غیبت کبریٰ	م (۳۲۹ھ/۹۴۰ء)

چونکہ رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے صغرسنی میں وفات پا گئے تھے، اس لیے آئمہ کرام کا سلسلۂ نسب آنحضرت کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور ان کے شوہر حضرت علی المرتضیٰؓ سے قائم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ جو آنحضرتؐ کے عم زاد بھائی تھے اور آپ کی تولیت میں رہے، شیعوں کے پہلے امام ہیں۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بیٹے ہیں، جن کی پرورش آنحضرت ﷺ نے انتہائی شفقت کے ساتھ فرمائی، بالترتیب دوسرے اور تیسرے امام ہیں۔ اثناء عشری عقیدہ کی رو سے امام حسینؓ کے بعد امامت ان کی مندرجہ بالا اولاد میں محدود رہی اور یہ سلسلہ بارہویں امام حضرت محمد المہدی تک برقرار رہا جو حکم الٰہی سے غیب میں چلے گئے تاکہ قیامت تک مومنین کی ہدایت کرتے رہیں۔(۱)

اہلِ بیت اور ہدایتِ الٰہی:

اہلِ شیعہ نے یہ عقیدہ کہ مذہبی ہدایت آلِ رسول ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، ان قرآنی آیات سے ماخوذ کیا ہے، جن میں پیغمبروں کی اولاد کو ہدایت یافتہ، پاکیزہ اور عالی مرتبت بتایا گیا ہے۔ انبیاء کرامؑ کی ہر زمانہ میں یہ آرزو رہی کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ان کو جس لطفِ خاص سے نوازا ہے، وہ ان کے خاندان میں بھی برقرار رہے اور ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔ قرآن میں بار بار ارشاد ہوا ہے کہ ان پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لیے دُعا مانگی ہے اور یہ التجا کی ہے کہ رشد و ہدایت کا سلسلہ ان کے سلسلۂ نسب میں

قائم رہے۔قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں انبیاء کرام کی اولاد کو اس لطفِ خاص سے نوازنے کی تصدیق کی گئی ہے، تاکہ وہ فضیلت میں اپنے آباء کے مثل روحانی وراثت میں ان کے امین بن کر اس سلسلۂ رشد و ہدایت کو برقرار رکھیں۔

اس نکتہ کی وضاحت کے لیے یہاں پر صرف ان چند قرآنی آیات کا حوالہ دیا جارہا ہے، جو خاص طور پر ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے خاندان کے بارے میں جو فکر لاحق تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمایا:

"قال انی جاعلک للناس اماما. قال ومن ذریتی قال لاینال عهدی الظلمین." (البقرہ: ۱۲۴)

(میں تمہیں سب انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔ تو حضرت ابراہیمؑ نے سوال کیا، 'اور میری اولاد میں سے؟' تو ارشاد ہوا، 'میرا عہد ظالموں تک نہیں پہونچے گا'۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہدایتِ اولاد حضرت ابراہیمؑ میں انہیں تک محدود رہے گی جو پاکیزہ لوگ ہوں گے۔

ایسی ہی ایک اور آیتِ کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتے ہیں:

"ربنآانی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم. ربنا لیقیموا الصلوٰة فاجعل افئدہ من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون." (ابراھیم: ۳۷)

(اے میرے پروردگار! بے شک میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے حرمت والے گھر کے نزدیک وادی میں آباد کیا ہے جو بنجر ہے۔ اے پروردگار! تاکہ وہ نماز قائم کرتے رہیں اور لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں سے رزق عطا کر، تاکہ وہ شکر کرتے رہیں۔)

اس دُعا کا حوصلہ افزا جواب ملا اور ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

"اولئک الذین انعم الله علیهم من النبیّین من ذریه آدم. وممن حملنا مع نوح ومن ذریه ابراهیم واسرآءیل وممن هدینا واجتبینا." (مریم:۵۸)

(یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے پیغمبروں میں سے فضل کیا (یعنی) اولادِ آدمؑ میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا۔)

قرآن کی ایک اور آیت اولادِ حضرت ابراہیمؑ کے لیے اس لطفِ خاص کو اور بھی زیادہ مؤثر انداز میں بیان کرتی ہے۔

"ام یحسدون الناس علی مآ اتهم الله من فضله فقد اتینآ ال ابراهیم الکتب والحکمه واتینهم ملکا عظیما" (النساء: ۵۴)

(کیا وہ لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے۔ یقیناً ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور انہیں ایک بڑی سلطنت بھی عطا کی۔)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"ان الله اصطفی آدم و نوحا و آل ابراهیم و آل عمران علی العالمین" (آلِ عمران: ۳۳)

(بے شک اللہ تعالیٰ نے آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمرانؑ کو تمام جہانوں پر منتخب فرمایا ہے۔)

تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان آیات کی رو سے حضرت محمد ﷺ کا تعلق آلِ ابراہیم سے ہے۔ اہلِ حجاز حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مورثِ اعلیٰ ہی نہیں موسس کعبہ بھی مانتے ہیں، جس سے محمد ﷺ کی پچھلی چار پشتیں بطور متولی وابستہ رہی ہیں اور اس مذہبی امتیاز کے باعث سردارانِ مکہ میں شمار ہوتے رہے ہیں۔(۲)

یہ خاندانی پس منظر تھا جس میں حضرت محمد ﷺ کا بحیثیت خاتم النبیین اور دینِ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے احیاء کرنے والے کی حیثیت سے ظہور ہوا اور اس طرح آپ کی ذاتِ گرامی میں آلِ ابراہیمؑ کا تقدس اپنے معراج کمال کو پہنچ گیا، جس کا قرآن نے بار بار ذکر کیا ہے۔ انبیاء کرام کے عظیم المرتبت خاندان کی اس قرآنی تعبیر نے بعض مسلمانوں کو یہ باور کرنے پر مائل کیا کہ آپ کا جانشین آپ ہی کے خاندان کا کوئی فرد ہوسکتا ہے جو سوائے منصب نبوت کے آپ جیسی مقدس شخصیت اور خاندانی صفات کا حامل ہو۔ مذہبی سیادت کے اس قرآنی تصور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام میں شیعی جذبات کا آغاز آنحضرت کے مدنی عہد سے ہی ہو جاتا ہے جب آپ کے بعض صحابہؓ نے آپ کے عم زاد اور داماد حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو قریب ترین عزیز اور پیرو کی حیثیت سے آپ کے بعد امت کا رہنما سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد جب حضرت علیؓ کے لیے اس التفات خاص کو ایک واضح اظہار نہ ملا اور بعض دوسری مصلحتوں کی وجہ سے وہ اس سیادت سے محروم رہے۔ اس طرح پیغمبر اسلامؐ کی جانشینی کا معاملہ امت مسلمہ کی قیادت کے تصور سے الجھ کر رہ گیا اور اس قیادت کے مذہبی اور سیاسی پہلو کو مختلف تناظر میں مختلف اہمیت کا حامل سمجھا گیا۔ بعض کے لیے یہ مذہبی سے زیادہ سیاسی اور بعض کے نزدیک سیاسی سے زیادہ مذہبی معاملہ ہوگیا۔ چونکہ اسلام حیاتِ انسانی کے دنیاوی و اخروی تمام پہلوؤں پر محیط ہے، اس لیے خاتم الانبیاء کی حیثیت سے اللہ کا پیغام پہنچانا پیغمبر اسلام کا بنیادی فرض تھا۔ لیکن آپ کو مدینے میں نو تشکیل شدہ امتِ مسلمہ کی بحیثیت دنیاوی حکمران اور رہنما کی ذمہ داری بھی لینا پڑی۔ اس اعتبار سے اسلام اپنی تاریخ میں ایک مذہبی ضابطۂ حیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی و سماجی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس طرح اپنی وفات کے بعد مذہبی ورثہ کے ساتھ ایک سیاسی میراث بھی چھوڑی تھی۔ جب آپ نے وفات پائی تو آپ کے رفقاء کی اکثریت نے یہ باور کیا کہ آپ کے جانشین کا بنیادی فرض شریعت کی حفاظت کرنا، ملت کو انتشار سے محفوظ رکھنا، اس کے مذہبی و سیاسی تشخص کو برقرار رکھنا اور اسلام کے پیغام کی اشاعت کرنا ہے۔ لیکن ربانی اور

روحانی ہدایت کا تسلسل باقی رکھنا اس کا منصب نہیں جو پیغمبر کے وصال کے ساتھ ختم ہو گیا لیکن ایک مختصر سے گروہ کو اس ترجمانی سے اختلاف تھا۔ گو وہ اس عقیدہ پر قائم تھا کہ نبوت آنحضرت ﷺ پر ختم ہو گئی اور کوئی اس کا دعویٰ دار نہیں ہو سکتا، تاہم ہدایت الٰہی ان کے جانشینوں کے ذریعہ جاری رہنی چاہیے اور ان کی ذات میں پیغمبر کی طرح دینی اور دنیاوی سیادت مجتمع ہونی چاہیے۔ ان میں آلِ ابراہیم کی خاندانی پارسائی اور خانوادۂ ہاشم کا جو آنحضرت ﷺ کے قبیلے کے سردار اور متولی کعبہ تھے، نسبی تقدس ہونا ازبس ضروری ہے۔ لہٰذا اس گروہ کے لیے پیغمبر کی جانشینی کا مسئلہ دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مذہبی و روحانی اہمیت کا حامل تھا۔ ان کے نزدیک یہ ہدایتِ ربانی کے تسلسل کا انتہائی اہم معاملہ تھا جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ اور منتخب آئمہ اہلِ بیت کی وساطت ہی سے جاری رہ سکتا تھا۔ کیونکہ آئمہ کرام ہی وحی الٰہی اور سنتِ رسول ﷺ کے مستند شارح تھے۔(۳)

بنیادی عقائد:

(۱) توحید، (۲) نبوت جو حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گئی اور قرآن جو بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور (۳) معاد۔

یہ وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو شیعوں اور سنیوں میں مشترک ہیں اور اخوتِ اسلامی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآن مجید کے متعلق شیعوں کا عقیدہ بالکل وہی ہے جو اہلِ سنت اور باقی تمام لوگوں کا ہے۔ چنانچہ شیخ الصدوق محمد ابن بابویہ القمی (م ۳۸۱ھ/۹۹۱ء) جن کو موجودہ شیعیت کا (محمد ابن یعقوب الکلینی، م ۳۲۹ھ/۹۴۰ء کے بعد) ستونِ ثانی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی کتاب ''رسالہ الاعتقادات'' جو شیعہ عقائد کی پہلی اور معتبر ترین کتاب ہے، لکھتے ہیں:

''اعتقادنا ان القرآن الذی انزلہ اللہ تعالیٰ علی نبیہ محمد ﷺ ھو بین الدفتین و ھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک. ومبلغ سورہ عند الناس

مأة واربع عشر سوره. عندنا ان الضحى والم نشرح سوره واحده والأيلاف والم تر كيف فعل ربك سوره واحده. ومن نسب الينا: "انا نقول إنّه اكثر من ذلك فهو كاذب"(۴)

(قرآن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ قرآن جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (حضرت محمد ﷺ) پر نازل فرمایا تھا، وہ وہی ہے جو (اس وقت) بین الدفتین میں ہے اور جو (آج) لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور اس سے زیادہ نہیں ہے اور سورتوں کی تعداد جو عام لوگوں کے ہاں جانی پہچانی ہے، اک سو چودہ (۱۱۴) ہے۔ اور ہمارے نزدیک (سورہ) الضحیٰ اور (سورہ) الم نشرح ایک سورہ ہے اور ''الایلاف'' اور ''الم تر کیف فعل ربک'' بھی ایک ہی سورہ ہے۔ اور جو شخص ہمارے بارے میں یہ کہے کہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن اس سے زیادہ تھا، وہ کاذب ہے۔)

بہرحال مذکورہ بالا تین عقائد یعنی توحید، رسالت اور معاد کے علاوہ شیعہ دو مزید عقائد کا اضافہ کرتے ہیں: (۴) عدل اور (۵) امامت۔ شیعہ ان دونوں کو اسلامی شعورِ مذہبی کی تکمیل کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ جہاں تک عدل کا تعلق ہے، شیعہ اسے الوہیت کا وصف ذاتی مانتے ہیں، خارج الذات نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ نقطۂ نظر ارادۂ الٰہی سے زیادہ عقلِ الٰہی پر مبنی ہے۔ اسلام کے عہد اوّل میں یہ نظریہ شیعیت کے ساتھ مخصوص نہیں تھا۔ معتزلہ بھی اس کے قائل تھے جن کا تعلق سنی اسلام سے تھا۔ گو معتزلی مکتب فکر وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا، لیکن شیعیت میں یہ عقیدہ برقرار رہا۔ مگر جو بات شیعیت کو سنیت سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے آلِ رسول کی امامت کا بنیادی عقیدہ۔ شیعی نظریہ کی رو سے مذہبی قیادت کا اہلِ بیت تک محدود ہونا اور ان کی روحانی صفت امامت کے دو پہلو ایسے ہیں جو باہم پیوست ہی نہیں ایک دوسرے میں نفوذ بھی کر گئے ہیں۔

نظریۂ امامت:

امام کے لفظی معنی قائد یا رہنما کے ہیں۔ لیکن شیعیت کی نظر میں امام سے مراد وہ شخص ہے جو ختمِ نبوت کے بعد ہدایت الٰہی کو جاری رکھنے کے لیے مامور من اللہ ہوتا ہے۔[۵] اسے ولایت بھی کہا جاتا ہے، جو کم وبیش امامت کے ہم معنی ہوتی ہے۔ تاہم ولایت، امام کے اس وصفِ خاص پر دلالت کرتی ہے جو وحی کی باطنی تفسیر کے لیے اسے اللہ کی جانب سے ودیعت ہوتی ہے۔ ولایت میں دوست یا قریب ہونے کا مفہوم موجود ہے، لہٰذا شیعی اصطلاح میں ولی وہ ہے جو محبت اور سپردگی کے سبب اللہ سے قربِ خاص رکھتا ہے اور اسی لیے اسے مذہب کے علم باطنی کا امین بنایا گیا ہے۔ اس لحاظ سے آئمہ سب سے برگزیدہ اولیاء اللہ ہیں۔[۶]

امامت ''نص'' اور ''علم'' کے دو اصولوں پر مبنی ہے۔ نص سے مراد یہ ہے کہ امامت وہ استحقاق ہے جو اللہ اہلِ بیت کے کسی منتخب شخص کو تفویض کرتا ہے اور پھر امام اس استحقاق کو اپنی وفات سے قبل ہدایتِ الٰہی کے بموجب کسی دوسرے کو منتقل کرتا ہے۔ ہدایتِ الٰہی جو بنی نوعِ انسان کے لیے ضروری ہے، اسے جاری رکھنے کے لیے سب سے پہلی نص خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اور اس اوّلین نص کے ذریعہ آپ نے وفات سے قبل ہدایتِ الٰہی کے بہ موجب علی بن ابی طالب کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لہٰذا نص کی سند پر امامت ہر قسم کے سیاسی حالات میں علیؓ اور فاطمہؓ کی اولاد میں سے کسی مخصوص فرد تک محدود رہتی ہے، خواہ وہ اپنے لیے دنیاوی حکمرانی کا دعویدار ہو یا نہ ہو۔[۷]

امامت میں مضمر دوسرا اصول ''علم'' ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ امام کو فیضانِ الٰہی سے دین کا وہ علم ودیعت ہوتا ہے جو کسی اور کے لیے ممکن نہیں اور یہ علم اس کی وفات سے قبل صرف آنے والے امام کو منتقل ہوسکتا ہے۔ اس طرح صرف امام زمانہ ہی دینی امور اور مستند اور مطلق ذریعۂ علم بن جاتا ہے اور اس کی ہدایت کے بغیر کوئی بھی راہِ راست پر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ مخصوص علم قرآن کے ظاہری اور باطنی دونوں معنی پر محیط ہوتا ہے۔ ولایت مذہب کے اس باطنی

علم سے عبارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو تفویض کیا ہے اور آپ نے یہ علم حضرت علیؓ کو منتقل کر دیا۔ اس طرح یہ حضرت علی کے بعد آنے والے آئمہ کی میراث بن گیا، یہاں تک کہ یہ علم بارہویں امام محمد المہدی تک پہونچ گیا۔(۸)

اثنا عشری شیعیت میں نظریۂ امامت، علم اور نص کے ان ہی دو اصولوں کے گرد گھومتا ہے جو ایک دوسرے سے پیوست ہی نہیں بلکہ مذہبی سیادت کے ایک وحدانی تصور میں مربوط ہیں اور انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا نص فی الواقع مذہب کے اس مخصوص علم کی ترسیل ہے جو بلاشرکتِ غیرے جائز طور پر آئمہ اہلِ بیت پر لطف خداوندی کے طور پر محدود رہا اور حضرت علیؓ کی وساطت سے ایک سے دوسرے امام تک مقدس میراث کے طور پر منتقل ہوتا رہا۔

وضائفِ امامت:

امام کے تین وظائف ہیں:

(۱) قرآن وسنت کی تشریح اور شریعت کی تعبیر کرنا۔

(۲) ایک روحانی رہنما کی حیثیت سے لوگوں کو چیزوں کے باطنی (یا حقیقی معنی سے آشنا کرنا اور ان دوخواص کی بنا پر اگر حالات سازگار ہوں تو

(۳) حکومت کی ذمہ داری سنبھالنا۔

شیعیت کے نزدیک امامت اللہ اور بندوں کے مابین ایک عہد ہے اور امام زمانہ کو تسلیم کرنا ہر مومن پر لازم ہے۔ آئمہ زمین پر اللہ کی حجت ہیں، ان کے ارشادات اور فیصلے خدا کی مرضی سے ہوتے ہیں، جن کے لیے وہ پورے طور پر مجاز ہیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور ان کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ انہیں معجزات اور ناقابلِ تردید دلائل پر قدرت ہوتی ہے: ''میرے اہلِ بیت تمہارے درمیان کشتیٔ نوح کی طرح ہیں، جو اس کشتی میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور اسے درِ توبہ تک رسائی ملی۔'' باری تعالیٰ نے آئمہ کرام کو تمام عالم پر روحانی حاکمیت بخشی ہے کیونکہ دنیا ہر وقت کسی ہادی اور رہنما کی محتاج رہتی ہے۔(۹)

شیعی عقیدہ کی رو سے امامِ زمانہ لوگوں کے لیے گواہ ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے رہنما، راستہ اور دروازہ ہے۔ وہ علم الٰہی کا مخزن، وحی کا شارح اور توحید کا ستون ہے۔ ان وظائف کے پیشِ نظر امام کو معصوم اور خطا و معصیت سے مبرا ہونا چاہیے۔ امام کے منزہ عن الخطا ہونے سے دین و شریعت کے امور میں اس کے فیصلوں کی صحت کی ضمانت ملتی ہے اور اس کی ذات کے زہد و تقدس کا تحفظ بھی ہوتا ہے۔[۱۰]

امام کے وظائف کی خلافت سے متعلق سنی نقطۂ نظر کے ساتھ موازنہ کرنے سے بہتر توضیح ہوسکتی ہے۔ (اہلِ سنت کے نزدیک) خلیفہ شریعت کا خادم ہے، جبکہ امام اس کا مستند محافظ وامین اور شارح ہے۔ خلیفہ کو امت منتخب کرتی ہے جب کہ امام کو اس کا پیشرو نامزد کرتا ہے۔ یعنی خلیفہ کا تقرر عوام کی خواہش پر ہے جبکہ آئمہ کا تقرر ''امرِ الٰہی'' کے تحت نامزدگی پر مبنی ہوتا ہے۔ خلیفہ ارتکاب گناہ پر معزول ہوسکتا ہے جبکہ امام معصوم اور خطا و معصیت سے مبرا ہے۔ خلیفہ کا ہونا یا نہ ہونا دونوں ہی صورتیں ممکن ہیں، لیکن امام کا ہر زمانے میں ہونا لازم ہے، خواہ وہ حاضر ہو یا غائب۔ جیسا کہ فی زمانہ امام مہدی کا تصور ہے۔ شیعوں کے نزدیک امام غائب پیغمبر کے فیوض و برکات کا تسلسل اور تحفظِ قرآن کا وسیلہ ہے۔ ان وظائف کے سبب امام منصوص من اللہ ہوتا ہے اور وہ اپنی قیادت کا حق اور سند عوام کی بجائے اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔

امام کا تیسرا وظیفہ یعنی امت کی حکمرانی کا استحقاق، پہلے دو وظائف کا منطقی نتیجہ ہے۔ امام دینی اور دنیوی دونوں امور میں سے لوگوں کے لیے بہترین قائد ہوسکتا ہے، لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوں اور امامِ وقت کو حکمرانی کی اجازت نہ دیں تو اثناء عشری شعیت کی رو سے اس کے لیے اپنا حق بزور شمسیر حاصل کرنا واجب نہیں۔ (جبکہ زیدی شیعہ اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ امام پر فرض ہے کہ وہ اپنا حق بزور شمشیر حاصل کرے)، اس کا مقام حکمران سے بلند تر ہے۔ اس لیے جنہیں دنیاوی اقتدار حاصل ہو، ان پر یہ لازم ہے کہ وہ امام کے ان فیصلوں کی بجا آوری کریں جو وہ ایک مذہبی مقتدرِ اعلیٰ کے طور پر کرتا ہے۔

فرائضِ مذہبی:

شیعوں کے لیے سات ایسے مذہبی فرائض ہیں جو بطور عبادتِ الٰہی واجب ہیں:

(۱) پانچ وقت نماز ادا کرنا، (۲) ماہِ رمضان کے روزے رکھنا، (۳) مالی و جسمانی استطاعت ہو تو زندگی میں ایک بار حج ادا کرنا، (۴) زکوٰۃ دینا یعنی سال کے آخر میں بعض اشیاء پر ڈھائی فیصد سالانہ حصہ غربا اور فلاحِ عامہ کے لیے نکالنا، (۵) خمس یا سالانہ آمدنی کا پانچواں حصہ امامِ وقت کے استحقاق کے طور پر ادا کرنا، (۶) جہاد اور (۷) امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنے کی تلقین کرنا۔

ان میں سے پانچ ارکان دین یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد شیعی اور سنی دونوں ہی مسلک میں مشترک ہیں۔ اوّل الذکر چار ارکان کی ادائیگی میں معمولی سا فرق ہے۔ البتہ فریضۂ جہاد کی توجیہہ میں کسی حد تک اختلاف ہے۔ شیعوں کے نزدیک امام یا اس کے متبادل کی عدم موجودگی میں جہاد ضروری نہیں۔ مگر حالتِ اضطرار میں کہ دشمن حملہ کر دے اور ملک و ملت کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو تو پھر ہر فرد پر بذاتِ خود ملک و ملت کا دفاع فرض ہو جاتا ہے۔ ''خمس'' اور ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' صرف شیعوں میں فرض ہیں۔ شیعہ زکوٰۃ کے علاوہ سالانہ بچت یا غیر متوقع فاضل آمدنی کا پانچواں حصہ (خمس) امامِ وقت کے لیے ادا کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں یہ حصہ آپ کے لیے مخصوص تھا، آپ کی وفات کے بعد شیعوں نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھا کہ یہ رقم امام اور سادات کو دی جائے۔ اس مذہبی محصول کا نصف امام کے حصے کے طور پر یا اعلم العلماء جو مرجع تقلید بھی ہوتا ہے، کو دیا جاتا ہے اور جو غیبت امام میں نائب امام کی حیثیت سے اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ باقی نصف رقم آلِ رسول کے لیے مختص ہوتی ہے اور خاص کر ان کے حاجت مند افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ تاکہ ان کی عزت کو افلاس کی بے توقیری سے بچایا جا سکے اور ان کے لیے احترام و محبت کا اظہار بھی ہوتا رہے۔ جہاں تک ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا تعلق ہے، یہ شیعوں نے اپنے لیے ضروری

قرار دیا ہے تاکہ مذہبی جذبہ کو تقویت ملے اور اس کی اثر پزیری قائم رہے۔ ابتداء میں یہ صرف شیعوں ہی کا عقیدہ نہیں تھا بلکہ معتزلہ بھی اس کو فرض مانتے تھے، تاہم اب یہ صرف شیعوں ہی میں صوم وصلوٰۃ کی طرح ایک فریضہ سمجھا جاتا ہے۔

دوسرے شعائر مذہبی:

مذکورہ بالا فرائض کے علاوہ دو اور مذہبی رسوم ایسی ہیں جنہیں اثناء عشری شیعہ انتہائی جذبۂ عقیدت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ایک حضرت حسین ابن علیؑ کی شہادت کی یاد منانے اور دوسرے ائمہ اہلِ بیت کے مزارات کی زیارت کرنے کی ہیں۔ یہ رسمیں آئمہ پر عقیدہ رکھنے اور اہلِ بیتِ رسول سے محبت کرنے کا ایک فطری لازمہ اور عملی اظہار ہیں۔ گو یہ رسومات شرعی فرائض کی ذیل میں نہیں آتیں، تاہم انتہائی عقیدت سے ادا کیا جاتا ہے۔ دوسرے ارکان و عبادات کے علاوہ شیعہ ان رسوم کو اپنے اسلامی ترحم اور ظلم و تعدی کے خلاف نفرت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

شہادتِ حسین کی یاد منانا:

پیغمبر اسلام کے عزیز ترین نواسے، حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؓ کے فرزند اور اثناء عشری شیعوں کے تیسرے امام، حضرت حسینؓ ابن علیؑ اپنے ۷۲ عزیزوں اور ساتھیوں سمیت ۱۰ ارمحرم الحرام ۶۱ ہجری کو عراق میں کربلا کے میدان میں خاندانِ امیہ کے دوسرے حکمران یزید کی فوجوں کے ہاتھ انتہائی بے دردی سے شہید کر دیئے گئے۔ یزید کو خلافت کا منصب اپنے والد امیر معاویہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ یزید اسلام کے نام پر آمریت اور ظلم و جور کی علامت بن گیا تھا۔ آمریت اور ظلم واستبداد کا مجسمہ یزید یہ چاہتا تھا کہ حسین اس کی بیعت کر کے اس کے خلیفۂ اسلام ہونے کی تصدیق کر دیں اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیں۔ نواسۂ رسولؐ نے اسلام، انسانی آزادی اور اعلیٰ اقدار کی حفاظت کے لیے یزید کی اس خواہش کو رد کر دیا اور تاریخِ انسانی میں ''ذبحِ عظیم'' کی ایک لازوال روایت قائم کر دی۔ آپ کے خاندان کے اٹھارہ مرد جن میں چھ

ماہ کا ایک شیرخوار بچہ بھی شامل تھا اور چوالیس رفقاء آپ کے سامنے شہید کیے گئے اور پھر آپ نے انسانیت کی خاطر صداقت کی قربان گاہ پر اپنی جان بھی قربان کر دی۔ امام حسینؓ کی زخم خوردہ لاش گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندی گئی۔ آپؓ کے خیمے جلائے گئے اور لوٹے گئے۔ مجبور اور بے کس عورتوں کو بڑی بے شرمی کے ساتھ عراق اور شام کی سڑکوں پر پھرایا گیا۔ کوفہ میں ابنِ زیاد اور دمشق میں یزید کے بھرے دربار میں ان کے ساتھ قیدیوں جیسا ذلت آمیز سلوک کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے صرف پچاس سال کے اندر ہی خانوادۂ رسول ﷺ کا یہ مقدر بنا۔

شہادتِ حسینؓ محبان اہلِ بیتِ رسول کے لیے مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل واقعہ ثابت ہوا اور شیعت جذبات کی تشہیر و اشاعت کے لیے مؤثر ترین عامل بنا اور بالآخر اسلام میں شیعی تشخص کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ شہادتِ حسین کے المیہ نے شیعیت میں ایک ایسے جذباتی عنصر کا اضافہ بھی کیا جو نظریاتی دلائل کے مقابلہ میں انسانی نفسیات کے لیے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح شہادتِ حسین نے شیعیت کو ایک باضابطہ ظاہری تشخص بخشا اور آپ کے نام اور آپ کی یاد شیعوں کے جذبۂ مذہبی کا جزوِ لاینفک بن گئی۔

غرض المیہ کربلا کی یاد منانا ساری دنیا کے شیعوں کے لیے انتہائی مقبول جذباتی روایت بن گیا۔ محرم کے ابتدائی دس دنوں میں مجالس عزاء برپا کی جاتی ہیں، جن میں المیۂ کربلا اور امام حسینؓ اور اہلِ بیت پر کیے جانے والے سفاکانہ مظالم کا بیان نہایت ہی دل سوزی، رنج و غم اور رقت آمیز طریقے سے کیا جاتا ہے۔ یومِ عاشور کو ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں۔ سوز و سلام پڑھے جاتے ہیں اور اس حسین کا علم بلند کیا جاتا ہے جو میدانِ کربلا میں انتہائی بے بسی کے عالم میں شہید ہوا تھا۔ چونکہ محرم کی رسومات کے طریقے دیگر شرعی فرائض کی طرح متعین نہیں ہیں۔ اس لیے دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ اس کو اپنے اپنے مزاج اور سماجی و ثقافتی روایات کے مطابق مناتے ہیں۔ اس طرح عزداری کے رسوم و عادات، ظاہری اختلاف کے باوجود مقصد کی وحدانیت اور کثرت میں وحدت کی گواہی دیتے ہیں۔ اگرچہ ان رسوم کا تعلق المیۂ کربلا

سے ہے تاہم ان سے شیعوں کے ان احساسات کی بھرپور عکاسی بھی ہوتی ہے جو وہ بحیثیتِ مجموعی بنی نوع انسان کے مصائب سے ہمدردی اور مظلوموں کی حمایت کے لیے رکھتے ہیں۔ حجاز، عراق، لبنان، شام، مصر، ایران، ترکی، وسط ایشیاء اور برصغیر پاک و ہند نیز دنیا کے دوسرے حصوں کے شیعہ اپنے اپنے مقامی ونسلی ثقافتوں کے مطابق شہادتِ حسین کی یاد مناتے ہیں۔

المیۂ کربلا کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے زیرِ اثر اسلامی زبانوں میں ایک انتہائی بیش قیمت ادب بڑی کثرت سے تخلیق ہوا۔ المیہ ہمیشہ ادبِ عالیہ کی تخلیق کے لیے زرخیز ثابت ہوا ہے۔ واقعۂ کربلا میں وہ تمام مواد پوری شدت کے ساتھ موجود تھا جس نے ادباء، شعراء اور اہلِ قلم کو اپنی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ کربلا کے حوالے سے آفاقی اقدار اور اعلیٰ انسانی جذبات کا اظہار کرسکیں۔ عربی وہ پہلی زبان ہے جس میں کربلا پر مختصر مراثی لکھے گئے، لیکن جلد ہی دوسری اسلامی زبانوں کے شعراء نے بھی اس موضوع کو اپنا لیا۔ عربی، فارسی، ترکی، سندھی، پشتو اور اُردو زبانیں کربلا پر لکھی گئی نظموں، سوز و سلام اور مرثیوں سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو نے المیۂ کربلا کے موضوع سے اپنے ادبی سرمائے میں سب سے زیادہ اضافہ کیا۔ انیس و دبیر نے جو اُردو ادب کے باکمال شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں، مرثیہ کو ایک ایسے نقطۂ کمال تک پہنچا دیا ہے کہ ان کے مراثی نہ صرف اُردو بلکہ عالمی ادب کا سرمایہ بن گئے۔ اُردو ادب کے طالب علم کے لیے اب مرثیہ کی وہی اہمیت ہے جو شیکسپیئر کے ڈراموں کو انگریزی ادب میں حاصل ہے۔

آئمہ کے مزارات کی زیارت:

محرم منانے کے علاوہ آئمہ کے مزاروں کی زیارت شیعوں کے لیے مذہبی جذبہ کے اظہار کی دوسری مقبول ترین رسم ہے۔ شیعیت میں حجِ بیت اللہ فرض ہے، لیکن آئمہ کے مزارات کی زیارت اگرچہ فرض نہیں پھر بھی انتہائی بابرکت اور روحانی اہمیت کا حامل ایک اختیاری عمل ہے۔ چونکہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آئمہ ہدایت یافتہ مذہبی اور روحانی رہنما ہیں۔ اللہ کے ارادہ و

احکام کے امین ہیں اور اپنی عقیدت، محبت اور عبادت کی وجہ سے محبوب بارگاہِ ایزدی ہیں، لہٰذا ان کے مزارات عظیم مقاماتِ مقدسہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس لیے ہر شیعہ زندگی میں کم از کم ایک بار ان روضوں پر حاضری دینے کی تمنا رکھتا ہے۔ تا کہ ان کی عزت وتکریم کے ذریعے رحمتِ الٰہی کو برانگیز کر سکے جو ان مزاروں پر نازل ہوتی رہتی ہے۔ نجف، کربلا، مشہد اور سامرہ کے یہ مزارات اور شام میں امام حسین کی بہن حضرت زینب اور قم میں امام علی رضا کی بہن حضرت فاطمہ کے مزارات جو سونے اور چاندی سے مزین ہیں، لاتعداد شیعہ زائرین کی عقیدت کے مراکز ہیں۔ بہرحال برگزیدہ ہستیوں کے مزارات پر حاضری دینا اور ہدیۂ عقیدت پیش کرنا صرف شیعوں ہی کی روایت نہیں ہے، سنی مسلمانوں کی اکثریت صوفیاء اور اولیاء کرام کے مزاروں پر حاضری دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شیعہ اپنی عقیدت صرف آلِ رسول تک محدود رکھتے ہیں جبکہ سنی ہر اس شخص کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں جو روحانی و باطنی شرف کا حامل ہو۔

شریعت کے مآخذ:

شریعت کے مآخذ شیعہ اسلام میں بھی وہی ہیں جو سنی اسلام میں ہیں۔ یعنی قرآن، حدیثِ رسول ﷺ اور اجماع۔ اگرچہ ان کی تشریحات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ چوتھا مآخذ سنی اسلام میں قیاس ہے، شیعہ اس کی جگہ عقل کو دیتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے جو شریعت کا اصل مآخذ ہے، شیعہ اس کی وہی تفسیر مانتے ہیں جو آئمہ اہلِ بیت میں سے کسی ایک سے آئی ہو۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، سنی اسے اقوالِ رسول تک محدود رکھتے ہیں۔ جبکہ شریعت اس میں آئمہ کی احادیث کا اضافہ کرتے ہیں بشرطیکہ اس مسئلے پر کوئی حدیث رسول موجود نہ ہو۔ اس سے شیعوں کو اہلِ سنت کے مقابلے میں یہ سہولت حاصل ہے کہ انہیں ۲۶۱ سال کے طویلے عرصے تک جو پہلے امام حضرت علی سے بارہویں امام محمد المہدی کی غیبت تک ہے، احادیثِ رسول اور تواتر کے ساتھ ایک خاندان سے نسل در نسل استناد کے اتھ ملتی رہی ہیں۔ (غیبت سے مراد ظاہری نگاہوں سے پوشیدہ ہو جانا ہے) اس کی رو سے بارہویں امام

صرف عالم ظاہری سے پردے میں چلے گئے ہیں، فوت نہیں ہوئے، لیکن ان کا تعلق دنیا سے بہرحال برقرار ہے۔

جہاں تک اجماع کا تعلق ہے، شیعہ جماعت اس سے کسی فقہی مسئلہ پر ائمہ کی رائے کے متعلق علماء کا اتفاق مراد لیتی ہے۔ جہاں تک قیاس کا تعلق ہے، شیعوں نے اس کی جگہ عقل کو شریعت کا مآخذ قرار دے کر نسلی تمثیلی استخراج (قیاس) کو مزید وسعت دی ہے۔ اس تبدیلی کا یہ جواز پیش کیا گیا ہے کہ مذہب ہر اس بات سے اتفاق کرتا ہے، جس کی عقل حمایت کرتی ہے۔ اس طرح وحی کے ساتھ ساتھ عقل کو اس کا جائز مقام دیا گیا ہے۔ یہاں بھی شیعہ اور سنی معتزلہ کا مسلک ایک ہو جاتا ہے۔

شیعوں کی ایک اور خصوصیت مسئلۂ اجتہاد ہے یعنی اصل مآخذ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی مجتہد کا اپنی ذاتی کوشش سے اپنے عہد کے کسی فقہی مسئلہ کا حل تلاش کرنا۔ سنی اسلام میں چاروں آئمہ کرام، جن کا تعلق اسلام کی دوسری اور تیسری صدی سے تھا، ابو حنیفہ، مالک بن انس، محمد بن ادریس الشافعی اور احمد بن حنبل کی وفات کے بعد باب اجتہاد (تقریباً) بند کر دیا گیا۔ ان مجتہدین اربعہ نے اپنے اپنے زمانے میں جو کچھ طے کر دیا، اہلِ سنت کے ہاں اس کا اتباع (قریب قریب) امت پر واجب ہو گیا۔ اور کسی کو اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے برعکس شیعوں نے باب اجتہاد ہمیشہ کھلا رکھا ہے اور ہر دور میں مجتہدین اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق ہر نئے آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے اصل مآخذ سے رجوع کر سکتے ہیں[11]۔ ہر عہد کا مجتہد امام غائب کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنا وظیفہ انجام دیتا ہے اور امورِ شریعت میں شیعوں کے لیے ان کا اتباع لازم ہوتا ہے۔ نجف (عراق) میں حضرت علیؓ کے روضے کے گرد اور قم (ایران) میں حضرت امام رضا کی بہن حضرت فاطمہ کے مزار کے ساتھ علمی مراکز قائم ہیں، جن کو حوزہ علمیہ سمجھا جاتا ہے اور مجتہدین انہی درسگاہوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ بہرحال باوجود بنیادی مآخذ کی تشریحات اور تعبیرات میں جزوی اختلافات کے، شیعی اور سنی مسلک کے مابین شرعی فرائض کی ادائیگی میں اختلاف آراء

اس سے زیادہ نہیں جو سنی اسلام کے چار فقہی مکاتبِ فکر میں پایا جاتا ہے۔ تاہم شیعہ اپنے عقیدہ کو اس صورت میں پوشیدہ رکھنا مباح سمجھتے ہیں جہاں اس کے اظہار سے زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔ اسے تقیہ کہا جاتا ہے۔ اموی اور عباسی خلافت میں عوام کی ائمہ سے وفاداری اقتدار کے لیے خطرہ سمجھی جاتی تھی اور محبانِ اہلِ بیت کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر تقیہ کی اجازت دی گئی۔ مزید برآں شیعہ متعہ یا عارضی نکاح کی وقتی اجازت کا منسوخ نہیں سمجھتے، جو آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں خصوصاً زمانۂ جنگ میں دے رکھی تھی۔

شیعی ادب:

اثناءعشری شیعوں نے اپنی کتب حدیث اور فقہ کی خود تدوین کی ہے۔ شیعوں میں علمی، ادبی سرگرمیاں حضرت علی بن ابی طالب کے عہد ہی میں شروع ہوگئی تھیں۔ لیکن انہیں امام جعفر الصادق کے دور میں عروج ملا، جب آپ کے چار سو شاگردوں نے عقائد اور فقہ پر آپ کے مباحث اور روایات کو قلم بند کیا۔ یہ رسائل، ''اصولِ اربعہ مائۃ'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ امام جعفر الصادق کے بعد آنے والے چھ آئمہ کے متعدد شاگردوں نے بھی جو کچھ ائمہ سے سنا، اسے ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ ان شاگردوں میں سے بعض اپنے زمانے میں حدیث، فقہ اور الٰہیات پر سند مانے جاتے تھے۔ یہ شیعی مذہبی ادب کا پہلا اور تشکیلی دور تھا۔ تاہم شیعی ادب کی تدوین اور تشریح کا دور ائمہ کے عہد کے بعد شروع ہوا۔ ایک عظیم دینی عالم محمد بن یعقوب کلینی (وفات ۳۲۹ھ، غیبتِ کبریٰ کا سال) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حدیثِ اصول کافی کو مدون کیا، جس میں اصولِ اربعہ مائۃ اور دوسرے ائمہ کے عہد میں لکھے جانے والے بیشتر رسائل کو شامل کرلیا گیا۔(۱۲) اس کے بعد تین اہم تصانیف یعنی ''من لایحضرہ الفقیہ'' از شیخ الصدوق ابن بابویہ القمی ''الاستبصار'' اور ''تہذیب الاحکام'' از محمد بن الحسن طوسی (وفات ۴۶۰ھ) منظرِ عام پر آئیں۔ ان چاروں کتابوں نے شیعیت کو مستحکم بنیادیں فراہم کیں اور اس وقت سے اب تک شیعی حدیث، اصولِ فقہ، قانون اور الٰہیات کا بنیادی مآخذ رہی ہیں۔

یہی وہ زمانہ تھا، جس میں سیّد شریف رضی (وفات ۴۰۶ھ) نے حضرت علی المرتضیٰ کے مواعظ، خطبات، احکام اور مکتوبات کو یکجا کیا جو اس وقت تک مختلف احادیث اور سیر و تاریخ کی ابتدائی کتابوں میں بکھرے پڑے تھے۔ اسے آج نہج البلاغہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے(۱۳) اور شیعوں کے لیے قرآن اور حدیثِ رسول کے بعد سب سے مقدس کتاب ہے۔ دوسرے مسلک کے مسلمان بھی اسے انتہائی عقیدت و احترام سے دیکھتے ہیں اور اہلِ سنت کے متعدد اہلِ قلم اس کی شرح لکھنے پر متوجہ ہوئے ہیں۔ ان میں ابن ابی الحدید معتزلی کی شرح سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ ایک ضخیم شرح ہے اور اسلامی ادب میں کلاسیکی کی حیثیت رکھتی ہے۔(۱۴)

حضرت علیؓ شیعہ جماعت کے پہلے امام اور سنیوں کے چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔ آپ نے تیرہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ بچپن آنحضرت ﷺ کے سایۂ عاطفت میں گزرا اور یوں آپ کی پرورش اور تربیت پیغمبر اسلام کی آغوش نبوت میں ہوئی۔ شیعہ سمجھتے ہیں کہ ان حالات نے آپ کو اسلام کے بنیادی عقائد و افکار، تصورات و لائحۂ عمل، اصول اور آئیڈیل کی توجیہہ اور اخلاقی شعور کی تمام جہات کے بارے میں آپ کی توضیحات کو خاص طور پر ان لوگوں نے سب سے زیادہ مستند مانا جنہوں نے پیغمبر کے بعد آپ کا اتباع کیا۔

نہج البلاغہ کے موضوعات کو تاریخ، نظریاتی اور اخلاقی عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک تاریخی امور کا تعلق ہے، اعلانِ نبوت (۶۱۰ھ) سے اپنی وفات (۶۱۱ء) تک ظہور پذیر ہونے والے واقعات میں آپ بہ نفسِ نفیس شریک رہے۔ لہٰذا آپ کے بیانات اسلام کے تشکیلی دور کی سب سے زیادہ معتبر عصری روئیداد ہیں۔ جہاں تک عقائد پر اظہار و رائے کا معاملہ ہے، آپ سے زیادہ مستند کون ہوسکتا ہے جس نے رسول اللہ ﷺ سے بچپن ہی سے براہِ راست کسبِ فیض کیا ہو۔ مزید برآں آپ خود ایک امام اور ولی ہونے کے ناطے سے اسلام کی بنیادی تعلیمات (کی تشریح) میں شیعہ عقیدے کے مطابق فیضانِ ایزدی سے بہرہ یاب تھے۔ نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق درج ذیل اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کا فلسفیانہ ذہن اسلامی تعلیمات سے کس درجہ منور و مزین تھا

اوران کی تعبیر وتشریح میں آپ کی بے مثال فصاحت و بلاغت کو کس قدر قدرت حاصل تھی۔

"الحمد الله الذی لایبلغ مدحه القائلون، ولایحصی نعماء ه العادون، ولایودی حقه المجتهدون، الذی لایدرکه بعد الهمم ولاینااله غوص الفطن الذی لیس لصفته حد محدود ولانعمت موجود، ولا وقت معدود، ولا اجل ممدود، فطر الخلائق بقدرته، ونشر الریاح برحمته، ووتد بالصخور میدان ارضه! اوّل الدین معرفته وکمال معرفته التصدیق به، وکمال التصدیق به توحیده وکمال توحید الخلاص له، وکمال الاخلاص له نفی الصفات عنه، لشهاده کل صفه انها غیر الموصوف وشهادة کل موصوف انه غیر الصفة، فمن وصف الله سبحانه فقد قرنه، ومن قرنه فقد ثناه، ومن ثناه فقد أشار الیه، ومن اشار الیه فقد حده، ومن حده فقد عده، ومن قال "فیم؟" فقد ضمنه، ومن قال "علام؟" فقد أخلی منه، کائن لاعن حدث، موجود لاعن عدم، مع کل شئ لابمقارنه، وغیر کل شئ لابمزایله فاعل لابمعنی الحرکات والآله، بصیر إذ لامنظور إلیه من خلقه متوحد، إذ لاسکن یستانس به ولا یستوحش لفقده." (۱۵)

("تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جس کی مدح تک بولنے والوں کی رسائی نہیں، جس کی نعمتوں کو گننے والے گن نہیں سکتے۔ نہ کوشش کرنے والے اس کا حق ادا کر سکتے ہیں، نہ بلند پرواز ہمتیں اسے پا سکتی ہیں۔ اس کے کمالِ ذات کی کوئی حد مُعین نہیں، نہ اس کے لیے توصیفی الفاظ ہیں، نہ اس (کی ابتداء) کے لیے کوئی وقت ہے جسے شمار میں لایا جا سکے، نہ اس کی کوئی مدت ہے جو کہیں پر ختم ہو جائے۔"

"دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے، کمالِ معرفت اس کی تصدیق ہے، کمالِ تصدیق توحید ہے، کمالِ توحید تنزیہ و اخلاص ہے اور کمالِ تنزیہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ اپنی صفت سے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ چنانچہ جس نے ذاتِ الٰہی کے علاوہ صفات کو مانا، اس

نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا، اس نے دوئی پیدا کی، جس نے دوئی پیدا کی اسے اس کے لیے جزء کا اقرار کرنا پڑا، اور جو اس کے اجزاء کا قائل ہو وہ اس سے بے خبر رہا اور جو اس سے بے خبر رہا اس نے اسے قابلِ اشارہ سمجھ لیا اور جس نے اسے قابلِ اشارہ سمجھا، اس نے اس کی حد بندی کر دی اور جو اسے محدود سمجھا وہ اسے دوسری چیزوں کی قطار میں لے آیا، اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے، اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں۔ وہ ہے، ہوا نہیں، موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا، وہ ہر شے کے ساتھ ہے، نہ جسمانی اتصال کی طرح، وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے نہ جسمانی دوری کے طور پر۔'')

جہاں تک نہج البلاغہ کی اہمیت کا تعلق ہے، تو یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اس کے بعد شیعوں کے تمام اصنافِ ادب، وہ تفاسیر ہوں یا فقہ، اصولِ فقہ یا قانون، الٰہیات ہوں یا فلسفہ و اخلاقیات یا تصوف و عرفان، نہج البلاغہ سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ حضرت علیؑ کے افکار کی گہری چھاپ سنی تصانیف پر بھی صاف نظر آتی ہے، خصوصاً اخلاقیات، فلسفہ، تصوف اور عرفانیات پر تو ان افکار کی جلوہ گری دیدنی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نہج البلاغہ کے اثرات عربی لسانیات اور ادب پر بھی کافی گہرے پڑے ہیں جس کا ذکر عہدِ حاضر کے معروف سکالر اور مصلح شیخ محمد عبدہ نے اپنے اس دیباچے میں خاص طریقے سے کیا ہے جو انہوں نے نہج البلاغہ کا ایڈیشن اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔

شیعی تاریخ ادب میں اس کے بعد کا دور آٹھ سو سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، جو ایران میں منگولوں، صفویوں اور قاچاریوں اور ہندوستان کے مغلوں کے ادوار پر مشتمل ہے۔ اس عہد میں شیعی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ علومِ اسلامی کی ہر شاخ نے کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اتنی وسعت پائی کہ اس مختصر مضمون میں اس کا سرسری حوالہ بھی ممکن نہیں۔ اس میں ایران کا صفوی عہد اس لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے کہ اس زمانہ میں شیخ ابن عربی کا تصوف، ابنِ سینا کا فلسفہ، سہروردی کی اشراقی عرفانیات اور شیعی الٰہیات کا امتزاج اپنے عروج کو پہونچ گیا۔ اسلام کے بنیادی اصولوں اور عقائد کے حدود میں رہتے ہوئے، فلسفے، تصوف، الٰہیات

اور تھیا سوفی کا یہ امتزاج بعض عظیم شیعہ علماء خصوصاً میر باقر داماد (وفات ۱۰۴۱ء) اور صدر الدین شیرازی المعروف بہ ملا صدرا (وفات ۱۰۵۰ء) کے ہاتھوں اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گیا۔

مناجات اور دُعائیں:

اللہ تعالیٰ کو رحمٰن وغفار اور خالق و مالک کل ماننے کے بعد ہر مسلمان کے لیے از بس لازم ہے کہ اسے محبوبِ حقیقی مانتے ہوئے عبادت کے ذریعہ اس حقیقت کا اعتراف کرے۔ چنانچہ عبادات کی معینہ صورتوں یعنی نماز، روزہ وغیرہ میں اس کا اظہار و اقرار ہوتا ہے۔ لیکن ایک مخصوص باطنی کیفیت، قلبی سوز و گداز اور روح کے اضطراب کا اظہار دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دُعاؤں اور مناجاتوں سے ہوتا ہے۔ یہ مناجاتیں رضائے الٰہی پر راضی رہنے کا بھرپور اعتراف ہوتی ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور آئمہ اہلِ بیت نے باری تعالیٰ سے متعلق اپنے باطنی علم، روحانیت، تزکیۂ نفس، وصف اخلاقی، عشق الٰہی، نفس کشی، شیوۂ تسلیم و رضا کے ہمہ صفتی اظہار پر مشتمل بصیرت افروز مناجاتیں چھوڑی ہیں۔ یہ انسان کی بے بسی اور عجز و انکسار کے شدت احساس و توبہ کی گرم جوشی، توکل اور اس پر استقامت کا اظہار ہیں۔ یہ محض طلاقت لسانی نہیں، اظہارِ خلوص ہیں۔ الفاظ کی صناعی نہیں بلکہ نفس کی پشیمانی اور غیر متزلزل ایمان کی فریاد خدائی رحمت تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مناجتیں اسلام کا بہترین روحانی ادب ہیں۔

حضرت علی ابن ابی طالب کی بعض مناجاتیں ادبی شہ پارہ ہی نہیں بلکہ اسلام کے فلسفیانہ، صوفیانہ، مابعدالطبیعاتی، اخلاقی اور دینیاتی تصورات کا سرچشمہ بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت، قدرت، خلاقیت، لطف و احسان، عفو و کرم، ذاتِ باری تعالیٰ اور بندوں سے اس کا تعلق اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات ان مناجتوں میں والہانہ اور دل سوزی کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

آپ نے اپنے شاگرد کمیل بن زیاد کے لیے جو مناجات لکھی تھیں، ان کی چند سطور سے ان خوبیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"اللہم انی اسئلک برحمتک التی وسعت کل شئ وبقوتک التی غلبت بھاکل شئ وبعزتک التی لایقوم لھا شئ وبعظمتک التی ملأت کل شئ وبسلطانک الذی علیٰ کل شئ وبوجھک الباقی بعد فنآء کل شئ وباسمآئک التی ملأت ارکان کل شئ وبعلمک الذی احاط بکل شئ وبنور وجھک الشی اضآء لہ کل شئ. یانور یاقدوس یا اوّل الاولین ویا آخر الاٰخرین اللہم اغفرلی الذنوب التی تھتک العصم اللہم اغفرلی الذنوب التی تنزل النقم اللہم اغفرلی الذنوب التی تغیر النعم اللہم اغفرلی الذنوب التی تحبس الدعآء اللہم اغفرلی الذنوب التی تقطع الرجآء اللہم اغفرلی الذنوب التی تنزل البلآء اللہم اغفرلی کل ذنب اذنبتہ وکل خطیئہ اخطاتھا.(۱۶)"

(''اے اللہ! میں تجھ سے تیری اس رحمت کاملہ کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ تیری اس قدرتِ کاملہ کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس سے تو ہر چیز پر غالب ہے۔ جس کے سبب ہر چیز تیرے آگے جھکی ہوئی ہے اور جس کے سامنے ہر چیز عاجز ہے۔ تیری اس جبروت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ تیری اس سلطنت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو ہر چیز پر قائم ہے۔ تیری اس ذات کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو ہر شے کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہے گی۔ تیرے ان ناموں کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو ذرے ذرے میں جاری و ساری ہیں۔ تیرے اس علم کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس سے ہر چیز روشن ہے۔ اے نورِ حقیقی! اے پاک و پاکیزہ! اے سب اوّلوں سے اوّل اور سب آخروں سے آخر۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کر دے جو برائیوں سے محفوظ رکھنے والی پناہگاہوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کر دے جو عذاب نازل ہونے کی وجہ بنتے ہیں۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کر دے جو نعمتوں کو بدل کر انہیں آفت بنا دیتے ہیں۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کر دے جو دُعائیں قبول نہیں ہونے دیتے۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کر دے جن کی

وجہ سے رحمت کی اُمید ختم ہو جاتی ہے۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کر دے جو مصیبتیں نازل کراتے ہیں۔ اے اللہ! میرے ان سارے گناہوں کو معاف کر دے جو میں نے جان بوجھ کر کیے اور ان ساری خطاؤں سے درگزر کر جو میں نے بھولے سے کیں۔'')

اسی طرح چوتھے امام حضرت زین العابدین جنہیں سید السجاد یعنی عبادت گزاروں کا سردار کہا جاتا ہے، ان کی مناجاتوں کا مجموعہ ''صحیفہ سجادیہ'' یا ''صحیفہ کاملہ'' خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس مجموعہ کو ''زبور آلِ محمدؐ'' بھی کہا جاتا ہے۔ شہیدِ کربلا کے واحد زندہ بچ جانے والے فرزند امام زین العابدین نے اپنے والد اور خاندان کے اٹھارہ افراد کو اپنے سامنے سفاکانہ طور پر قتل ہوتے دیکھا۔ اس سانحۂ عظیم نے آپ کی روح پر گہرا اثر چھوڑا اور آپ کو ہمیشہ اشکبار رکھا۔ آہ وزاری کی ہیجان انگیز مناجاتوں میں ڈھل کر وصلِ الٰہی کی آرزو اور حیاتِ باطنی کے سارے رموز اسی کے سپرد کر دینے کی خواہش سے عبارت ہوگئی۔ ان مناجاتوں سے یہ تأثر ابھرتا ہے کہ زندگی کے ہاؤ ہو میں، نادیدہ آفات میں، روحانی طمانیت کی تلاش میں ایک تنہا اور بے بس انسان اپنے خالق کے حضور دل کی گہرائیوں سے صدا دے رہا ہے۔ اسی طرح صحیفۂ کاملہ کی مناجاتیں اللہ اور بندے، عابد ومعبود، آقا اور غلام، عاشق ومحبوب، رنجور وسکوں بخشنے والے، جزئی اور کلی ذاتوں، رشتوں کا بہترین اظہار ہیں۔

درج ذیل اقتباس سے ان مناجاتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ان مناجاتوں میں موجود ہیں۔

''اللهم یامن برحمته یستغیث المذنبون ویامن الی ذکر احسانه یفزع المضطرون ویامن لخیفته ینتحب الخاطئون. یاانس کل مستوحش غریب ویافرج کل مکروب کئیب ویاغوث کل مخذول فرید ویاعضد کل محتاج طرید انت الذی وسعت کل شئ رحمته علما وانت الذی جعلت لکل مخلوق فی نعمک سهما وانت عفوه اعلی من عقابه وانت الذی تسعی رحمته امام غضبه وانت الذی عطآوه اکثر من منعه وانت الذی اتسع الخلآئق کلهم فی

رحمته وانت الذی لایرغب فی جزآء من اعطاه وانت الذی یافرط فی عقاب من عطاه وانا یاالهی عبدک الذی لایفرط فی عقاب من عصاه وانا یاالهی عبدک الذی امرته بالدعاء فقال لبیک وسعدیک ها انا ذا یارب مطروح بین یدیک.[۱۷]"

(''اے اللہ! اے وہ ذات جسے گنہگار اس کی رحمت کے وسیلہ سے فریادرسی کے لیے پکارتے ہیں۔ اے وہ ذات! جس کے لطف واحسان کی یاد کا سہارا بے کس و لاچار ڈھونڈتے ہیں۔ اے وہ ذات جس کے خوف سے عاصی وخطاکار نالہ وفریاد کرتے ہیں۔ اے وہ ذات جو ہر غریب الوطن کے دل شکستہ کا سرمایۂ انس ہے اور ہر غمزدہ دل شکستہ کا غمگسار، اے وہ ذات جو ہر بے کس وتنہا کا فریادرس ہے اور ہر راندہ ومحتاج کا دست گیر، تو ہی تو ہے جو اپنے علم ورحمت سے ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ اور تو ہی تو ہے جس نے اپنی نعمتوں میں ہر مخلوق کا حصہ رکھا ہے۔ تو ہی تو ہے جس کی رحمت اس کے غضب سے آگے چلتی ہے۔ تو ہی تو ہے جس کی عطائیں فیض و عطا کے روک لینے سے زیادہ ہیں۔ تو ہی ہے جس کے دامنِ وسعت میں تمام کائنات ہستی کی سمائی ہے۔ تو ہی تو ہے کہ جس کسی کو عطا کرتا ہے، اس سے عوض کی توقع نہیں رکھتا اور تو ہی تو ہے کہ جو تیری نافرمانی کرتا ہے۔ اسے حد سے بڑھ کر سزا نہیں دیتا۔''

''خدایا! میں تیرا بندہ ہوں جسے تو نے دُعا کا حکم دیا تو وہ لبیک لبیک پکار اُٹھا۔ ہاں! اے میرے معبود! میں حاضر ہوں، یہ بے بس بندہ میں ہی ہوں جو تیرے آگے خاکِ مذلت میں پڑا ہے۔'')

حواشی وحوالہ جات:

(۱) محمد ابن یعقوب الکلینی: اصول الکافی (تہران)، جلد اوّل، صفحات ۳۲۹ تا ۳۸۸، شیخ الصدوق محمد ابن بابویہ القمی، رسالہ الاعتقادات، مرکز نشر الکتاب (تہران ۱۳۷۰ھ) صفحہ ۱۱۰، انگریزی ترجمہ از آصف اے۔اے۔ فیضی: A Shite Creed، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (لندن، ۱۹۴۲ء)، صفحات ۹۵-۹۶۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤاجداد کرام کی مکہ کے معاشرے میں سیادت وقیادت اور عزت وعظمت کے لیے قدیم ترین اور معتبر مآخذ کے لیے ملاحظہ ہو: محمد ابن ہشام، سیرۃ رسول اللہ (قاہرہ ۱۹۳۴ء) جلد اوّل، صفحات ۴۵ تا ۹۸۔ محمد ابن سعد، کتاب الطبقات الکبری (بیروت ۱۹۵۷ء) جلد اوّل، صفحات ۵۸ تا ۹۱۔ محمد بن

جریر الطبری: تاریخ الرسل والملوک (لائیڈن ۱۸۷۹ء) جلد اوّل، صفحات ۲۸۶ و مابعد۔

عربوں کا خاندانی شرف وحسب ونسب پر فخر ومباہات کے تصور پر قبل اسلام کی شاعری اور دوسرے قدیم ترین مآخذ کا انتہائی محققانہ مطالعہ جرمن محقق Lgnacz Goldziher نے اپنی مشہور تصنیف: Muhammedanis Studien میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا انگریزی ترجمہ از: Muslim Studies: C.R. Berber and S.M. Stern (لندن ۱۹٦۷ء) جلد اوّل، صفحات ۴۵ تا ۹۸۔ مزید تفصیلات اور مآخذ کے لیے دیکھئے: The Oxford Encyclopaedia of the Modern World (نیویارک ۱۹۹۵ء) جلد ۴، صفحات ۱۱۔۱۲، آرٹیکل ''سید'' اور آرٹیکل Encyclopaedia of Shi'i Islam: Historical Overview، صفحات ۵۵-٦۰، Vol.IX، (۱۹۹۷ء Brill Leiden)، صفحات ۴۳۰ تا ۴۴۴۔ آرٹیکل ''شیعہ''۔

(۳) کلینی: اصولا لکافی، جلد اوّل، صفحات ۲۰۵-۲۰۷، شیخ الصدوق: محولہ بالا، صفحات ۹۷-۹۸۔

(۴) شیخ الصدوق: رسالۃ الاعتقادات (تہران ۱۳۷۰ء) صفحہ ۹۳۔ قرآن مجید کے متعلق تمام آئمہ اہلِ بیت اور ان کے بعد تمام شیعہ علماء کا یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ اس میں نہ کوئی تحریف ہوئی ہے اور نہ اضافہ۔ اس لیے وہ قرآن مجید کی آیت ''انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون'' (ہم ہی نے یہ قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک اصولِ کافی کی ان بعض احادیث کا تعلق ہے کہ شیخ کلینی کی، جنہوں نے شیعہ احادیث کا پہلا مجموعہ جمع کیا، انتہائی کوشش کے باوجود غلاہ (انتہاپسندوں) کی بعض احادیث اصول الکافی میں شامل ہو گئیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت علیؑ ہی کے دور سے کوفے میں غلاہ کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو حضرت علیؑ کی الوہیت سے لے کر ائمہ اہلِ بیت کی مافوق الفطرت شخصیات اور خصائص کے لیے ہزاروں کی تعداد میں احادیث وضع کرتا رہتا تھا۔ چونکہ یہ گروہ امام محمد الباقر اور امام جعفر صادق کے زمانے میں بہت فعال تھا۔ اس لیے اکثر احادیث ان دو ائمہ کی طرف منسوب کر دیتا تھا، ان ہی میں وہ احادیث بھی ہیں جن سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ بعض قرآنی سورتیں فضائل ائمہ و اہل بیت کے لیے نازل ہوئی تھیں، جن کی تعریف کر دی گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام ائمہ اہلِ بیت نے ان غلاہ پر ہمیشہ لعنت بھیجی ہے اور اپنے ماننے والوں کو تنبیہ کرتے رہے ہیں کہ ان کی احادیث کو قبول نہ کریں۔ علم حدیث سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی جمع کردہ تین لاکھ سے زیادہ احادیث میں سے صرف ساڑھے تین ہزار کا انتخاب کیا۔ اس انتہائی احتیاط وحزم کے باوجود پھر بھی کچھ ضعیف احادیث باقی رہ گئیں۔ اسی طرح شیخ کلینی کی انتہائی کوشش کے باوجود غلاہ کی کچھ احادیث جو لاکھوں کی تعداد میں منتشر ہو چکی تھیں، کافی میں شامل ہو گئیں لیکن خود کلینی اور بعد کے تمام شیعہ علماء نے ان کی پرزور تردید کی ہے، لہٰذا کافی کی ان احادیث سے جن کو شیعہ علماء رد کرتے

رہے ہیں۔ تحریفِ قرآن کے متعلق استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے: الکشی، عمر بن محمد، معرفہ اخبار الرجال (تہران، ۱۹۵۵ء) صفحات ۲۲۳ تا ۲۴۴ اور انڈکس۔ کوچے کے علاوہ اور ان کی سرگرمیوں اور احادیث اور ائمہ اہل بیت اور شیعہ علماء کے موقف کے بارے میں تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ایس۔ایچ۔ایم۔ جعفری کی کتاب: Origion and Early Development of Shi'a Islam، مطبوعہ (Longman, London, 1982, 4th Edition)، صفحات ۲۹۱ تا ۳۰۰ اور انڈکس۔

(۵) کلینی، محولہ بالا، صفحہ ۳۲۹، صدوق، محولہ بالا، انگریزی ترجمہ آصف اے۔اے؛ فیضی، A Shite Creed، صفحہ ۹۷۔

(۶) کلینی، محولہ بالا، صفحہ ۲۵۳۔ صدوق، محولہ بالا، صفحہ ۹۸

(۷) کلینی ایضاً، صدوق ایضاً۔ شیعون کے اصول نص کے لیے مزید ملاحظہ ہو ابوالحسن الاشعری۔ مقالات الاسلامین تحقیق ریٹر (استنبول ۱۹۲۹ء) صفحات ۱۶-۱۷۔

(۸) کلینی، محولہ بالا، صفحہ ۲۴۵-۲۴۷، صدوق، محولہ بالا، صفحہ ۹۷۔

(۹) کلینی، ایضاً، صدوق ایضاً۔

(۱۰) کلینی، صفحہ ۲۳۱ و مابعد، صدوق، ۹۹ و مابعد۔

(۱۱) ''کر سکنے'' اور ''کرنے'' میں جو فرق ہے وہ ہم کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ نظریہ کی حد تک تو یہ صحیح ہے کہ شیعوں نے باب اجتہاد کبھی بند نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر شیعہ سنت رسول ﷺ (اور سنتِ ائمہ) کے اتباع میں اپنے برادران اسلام اہلِ سنت سے بھی زیادہ روایت پسند ثابت ہوئے اور سوائے چند مخصوص مواقع کے انہوں نے اس جرات مندانہ اجتہاد سے کام نہیں لیا جس کا ان کو جواز حاصل تھا۔

(۱۲) کلینی کی کتاب اصول الکافی کے لیے ملاحظہ ہو، مندرجہ بالا نوٹ نمبر ۴۔

(۱۳) نہج البلاغہ کے بے شمار مطبوعہ نسخوں میں شاید سب سے بہتر ایڈیشن وہ ہے جو عہدِ حاضر میں مصر کے مشہور عالم شیخ محمد عبدہ نے ایک مبسوط مقدمہ اور تشریحات وحواشی کے ساتھ تیار کیا اور محمد احمد عاشور اور محمد ابراہیم البنا نے قاہرہ سے کتاب الشعب نامی سلسلے میں (تاریخ ندارد) شائع کیا۔ گذشتہ چند دہائیوں میں جو بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ان میں خاص طور سے لائقِ ذکر حسب ذیل ہیں۔ مصر ہی کے ایک مشہور عالم و محقق محمد ابوالفضل ابراہیم نے ایک ایڈیشن دو جلدوں میں حواشی وحل لغات کے ساتھ داراحیاء الکتب العربیہ قاہرہ سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر شیخ صبحی الصالح نے جو لبنان کے مشہور محقق اور جامعہ لبنان، بیروت میں ادبیات کے پروفیسر ہیں، ۱۹۶۷ء میں نہج البلاغہ کے دو اُردو ترجمے اور حواشی جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور رئیس احمد جعفری کے قلم سے ہیں، شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ۱۹۶۳ء میں لاہور سے ایک تیسرا ایڈیشن (ترجمہ وحواشی) مفتی جعفر حسین نے امامیہ کتب خانہ لاہور سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

(۱۴) شرح ابن ابی الحدید کے بہت سے ایڈیشن عراق و ایران وغیرہ سے شائع ہو چکے ہیں، لیکن سب سے بہتر اور آخری ایڈیشن مصر کے مذکورہ بالا مشہور محقق محمد ابوالفضل ابراہیم نے بیس جلدوں میں حواشی و حوالہ جات کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں (دوسرا ایڈیشن) شائع کیا ہے۔ شرح ابن ابی الحدید اگرچہ نہج البلاغہ کی شرح ہے، لیکن یہ تاریخ اسلامی کا ایک بیش بہا اور عظیم خزانہ ہے۔

(۱۵) نہج البلاغہ، تحقیق محمد احمد عاشور و محمد ابراہیم البنا، شرح الامام الشیخ محمد عبدہ، کتاب الشعب، ناصرہ (تاریخ ندارد) صفحات ۲۵-۲۶۔

(۱۶) شیخ عباس قمی: مفاتیح الجنان، (تہران ۱۳۷۰ھ) ''دُعائے کمیل'' صفحہ ۴۸-۴۹۔

(۱۷) صحیفہ کاملہ، محمڈن ٹرسٹ آف گریٹ بریٹن اور نارتھ آئیرلینڈ ۱۹۸۸ھ معہ انگلش ترجمہ از William C. Chittick، دُعا نمبر ۱۶، صفحہ ۵۵ و مابعد۔